ہے۔ جا کر دھوؤ۔'' میں بچے کو کندھے سے لگا کر کھڑا رہا۔ بانو نے آدھا دوپٹہ کھیل میں ڈال کر کھنگال لیا۔

ایسے وقت میں اور اس قدر شدید گرمی میں سڑک کنارے پیدل چلنا تو شاید اس قدر مشکل نہیں تھا لیکن ایک بچے کو کندھے سے لگا کر کلینک سے ذلیل و خوار ہو کر اور زمین سے بوٹ کے پرانے ڈبے کا گتا اٹھا کر اور اس سے مریض بچے کے چہرے کو چھاؤں کر کے چلنے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کچے پڑے ہوئے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے ہمارے سر اوپر نہیں اٹھتے تھے۔

سڑک پر کوئی سواری نہیں تھی اور ہمیں بس پکڑنے کے لیے ابھی بہت دور تک چلنا تھا۔ بچے کا بخار گرمی کی وجہ سے بڑھ رہا تھا اور بانو بار بار اس کے ماتھے اور تپتی ہوئی بے جان ٹانگوں کو چھو رہی تھی کہ بخار کم ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔

اس دھوپ اور گرمی میں ہم اسی طرح سے چلتے رہے۔ تھکے تھکے، خوفزدہ، مایوس، بے مراد اور اکیلے۔ بیمار بچے نے کئی مرتبہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن گرمی کی شدت اور روشنی کی چلکور نے اس کے پپوٹے کھلنے نہ دیے۔ ہم چلتے چلتے، سوچتے سوچتے، چپ چپاتے، جی پی او کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں تار گھر کے پاس کئی تانگے کھڑے تھے۔ درخت کی چھاؤں تلے بیمار بچے نے آنکھیں کھول کر ایک سفید گھوڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈوبتا ہوا سر ساکن کر لیا۔ میں نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا ''گورنمنٹ کالج'' اور بانو حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔

کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ پرندے شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اونچی بلڈنگ کے سائے دور دور تک پھیل کر درختوں کے سائے سے مل گئے تھے۔ سارے میں ایک خوشگوار خاموشی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انیق بانو کی گود میں لیٹا ہوا ایک اونچے درخت کی شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہا تو مجھے بانو کے دوپٹے سے کھٹی کھٹی بو سی آئی۔ میں نے بچے کے چھوٹے سے ماتھے پر اپنا ساتھ کا ماندہ چہرہ رکھا تو مجھے ایک بیماری ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچے نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی جنت گم گشتہ لوٹ کر اس کی جھولی میں آ گئی۔ بانو نے اس کے پاؤں کو، ماتھے کو اور گلے کو چھو کر خوشی سے میری طرف دیکھا اور کہا ''بالکل خواجہ منظور کی طرح مسکرایا ہے۔'' خواجہ صاحب اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار مسکرائے ہوں گے لیکن بانو کے ذہن میں ان کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے مثل ہو کر ایک فریم میں جڑی جا چکی تھی۔ پھر ہمارے ذہنوں میں اپنے ایام طالب علمی کا ایکشن ری پلے شروع ہو گیا اور طوطے اپنی چونچوں میں ڈالیاں پکڑ کر ہاتھ چھوڑ کر کرتب دکھلانے لگے۔

بیمار بچہ اپنی ماں کی گود سے پھسل کر پہلے ایک سیڑھی پر کھڑا ہوا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دوسری پر اترا اور پھر خود ڈگمگاتے قدموں سے روش پر چلا گیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ گز تک ایک طرف اور کوئی دو گز کے قریب دوسری جانب چلا اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

ابھی ہمیں سیڑھیوں پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نیلی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں چابیوں کا موٹا سا گچھا اٹھائے ایک شخص ہماری طرف آیا اور قریب آ کر پوچھنے لگا ''کون لوگ ہو تم؟''

میں نے کہا ''ہم لوگ ہیں۔''

اس نے کہا ''یہاں آنے کا اور بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''کس کا حکم نہیں۔''

"پرنسپل صاحب کا" اس نے درشت لہجے میں کہا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ میں کچھ کہنے والا تھا۔۔۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور آہستگی سے چلنے لگی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم آگے بڑھ رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ رہا ہے۔ کئی بیہودہ، نکمے، بدہیئت اور بےکار لوگ درگاہوں سے اٹھا دیئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فرش دھو دیئے جاتے ہیں لیکن ان کے دلوں کے فرش پر درگاہوں کی مورتیں ویسے ہی قائم رہتی ہیں۔

اصل میں گورنمنٹ کالج تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ اس کی طرف رخ نہ بھی ہو تو بھی یاتری اسی کی طرف کا سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جب سپیس شٹل زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور اس کی منزل چاند ہی ہوتی ہے۔

خالدہ نے کچھ تاثرات اپنی محبت کے تحت لکھے ہیں۔ یہ اُس کی سعادت مندی ہے۔ اللہ اُسے میرا دل رکھنے کی توفیق دے۔ ایسی محبت والی روحیں ہر روز کہاں پیدا ہوتی ہیں؟

"اے ترکِ غمزہ زن"

کتابِ زندگی کے کچھ اوراق ہم سینت سینت کے رکھتے ہیں۔ اُن کا ہماری روح کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ ہوتا ہے جو پاکیزگی اور تقدس کے پانیوں سے نمو پاتا حاصلِ حیات کا جزو بن جاتا ہے۔

قدسیہ آپا میری کتابِ زندگی کا ایسا ہی ورق ہے مگر اس اعتراف کی وضاحت کے لیے مجھے گزرے وقت میں بہت دور تک جانا ہوگا۔

یہ سن پچاس باون کے آس پاس کی بات ہے۔ لاہور کے لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کے خاموش، بارعب عمارتوں اور سرسبز روشوں پر وہاں کی پُروقار پرنسپل مسز چھٹہ اپنی چاق و چوبند چال کے ساتھ آتی جاتی نظر آتیں۔ گریس فل ساڑھی، گھنگھریالے کالے سفید بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا، ٹک ٹک کرتے کورٹ شوز۔ ہم جنتر منتر کی باڑ کے اُس پار سکول سیکشن کی بے بضاعت، چھٹی ساتویں جماعت کی لاغر لڑکیاں، دم سادھے جھانکا کرتیں۔ سانولے چہرے پر نفاست و پختگی میں رلے ملے نقوش۔ ہمیں سب کچھ کسی اور ہی دنیا کا نظر آتا۔ وہ باڑھ کے پار ہمارے بہت قریب سے گزر جاتیں مگر ہم وہیں منتظر کھڑے رہتے کیونکہ ان کے بعد کبھی کبھار ان کی چمپئی رنگت، کچھ نیپالی نقوش والی گیلی سی بیٹی اپنے سیاہ لمبے بالوں کی لمبی چوٹی جھلاتی، چھوٹے چھوٹے گورے پاؤں کے ساتھ کبوتری کی چال چلتی اُدھر سے گزرتی اور ہمارے دل کھلا اٹھتی۔ جس روز ہم اُسے دیکھ لیتے باقی ماندہ دن کتنا اچھا گزرتا۔

پھر وہ سکول میں سٹیج ہونے والے ایک ٹیبلو "عشق اور موت" میں ایک قدسی روپ میں نظر آئی۔ موتیا رنگ ساڑھی پہنے میں۔ عشق کی قوت سے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑاتی۔ آج میں سوچتی ہوں کہ قدسیہ آپا کے ساتھ میرا کیسا

علامتی تعارف ہوا جس نظریہ کی عملی تفسیر میں انہیں اپنی زندگی بسر کرنا تھی وہ کس طرح مجھ تک پہنچا۔

تب مجھے معلوم نہ تھا کہ یہی کامنی میری بہن کی عزیز ترین دوست ہوگی۔ میں اسے اتنا قریب سے دیکھوں گی بلکہ شب و روز کا ساتھ رہے گا اور ایک نئی دنیا کا دروازہ مجھ پر کھلے گا۔ لکھنے کی دنیا۔

پڑھنے کا خبط تو مجھے تھا ہی۔ کبھی نوخیز لڑکیوں جیسا اُلٹا سیدھا لکھ بھی لیتی تھی۔ قدسیہ آپا تب لکھتی تھیں مگر ابھی چھپنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی تخلیقِ فن کا پورا کلچر اُن کی ذات میں سانس لیتا تھا۔

تب مجھے اتنی باریکیوں کی سمجھ کہاں تھی۔ بس اتنا احساس ہوتا تھا کہ یہ جو قدسیہ آپا ہیں کسی کھلی بے تحاشہ بڑی طلسماتی دنیا سے آئی ہیں۔ باجی' منجھلے بھائی اور میری تو خیر بات ہی کیا اپنے کاموں میں بے حد مصروف رہنے والی اماں تک اُن کی گرویدہ ہو گئیں۔

سمن آباد میں خود ان کا اپنا گھر ہر ایک کے لیے کھلی آغوش کی مانند تھا۔ صاف ستھرا سادہ سے سامان سے مزین کمرے جہاں ہر کوئی بے تکلف چلا آتا۔ قدسیہ آپا ان کے مصور بھائی پرویز (کیا کمال کے آرٹسٹ تھے) اور امی۔ یوں لگتا یہ سب پیدائشی میزبان ہیں۔ یہ لوگ محبت اور ناز اُٹھانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ سراپا شفقت اُٹھتے بیٹھتے میں آپ کی آسائش و آرام کا خیال اور پھر باتیں۔ ایسی باتیں جو سارے غم فکر بھلا دیں۔ دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

اُن دونوں (بھائی بہن) میں زبان کا مبہوت کر دینے والا کمال تھا۔ انگریزی' اردو' پنجابی سب میں یکساں رواں۔ رفتہ رفتہ مجھے قدسیہ آپا کے بچپن کے بہت سے واقعات اور شگفتہ کردار بالکل چشم دید محسوس ہونے لگے۔ گورداس پور' دھرم سالہ' شملہ جنہیں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا اپنے اپنے لگنے لگے۔ معلوم نہیں آج بھی ہم اِن کی وضع کردہ کتنی اصطلاحیں اور روزمرے انجانے میں بولتے رہتے ہیں۔

دردمندی کے باوجود ان میں زندگی کی خوشگوار چیزوں سے محبت اور ناخوشگوار کو نظرانداز کر دینے کی تہذیب تھی۔ شاید یہ دِلّی کے غنی لوگ تھے۔ ان کے ہاں خصوصی طور پر لڑکیوں کی گرومنگ کا ایک تصور تھا۔ ایسی تربیت جو لڑکیوں کو سراپا خدمت و ایثار دوسروں کے لیے باعثِ راحت اور ماحول کو خوبصورت بنا دے۔

بزعم خود..... مجھے لگتا ہے کہ قدسیہ آپا کی صلاحیتوں کا جو شعور اور انداز مجھے ہے کسی اور کو شاید ہی ہو۔ انہوں نے میری بہن اور چند اور دوستوں کے ساتھ مل کر ان دنوں لاہور کے چھوٹے سے الحمرا ہال میں 'انارکلی' سٹیج کیا۔ ڈائریکشن اُن کی اپنی تھی' جنہوں نے میری بہن ایسی چھوٹی موٹی' معمولی سی ہستی سے شہزادہ سلیم کا کردار ادا کروا دیا۔ مناظر کے سیٹ اور کرداروں کے ملبوسات۔ ان سب کے لیے کتنا تاریخی و تہذیبی شعور اور ڈرامے کے فن پر دسترس حاصل ہونی چاہیے۔ انارکلی کے کردار میں قدسیہ آپا خود تھیں۔ ڈرامہ ہٹ ہوگیا۔ (جو صرف خواتین کے لیے تھا)۔

وہ جو انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی اور سٹیج کے لیے لازوال ڈرامے تخلیق کیے تو وہ ٹیلنٹ اور کرافٹ کے قابلِ رشک تال میل کا نتیجہ تھے۔ انہیں رقص' موسیقی' فوک لور' اردو' فارسی' پنجابی اور عالمی شعر و ادب کا جو وسیع و عمیق علم حاصل ہے غیر معمولی کے زمرے میں آتا ہے۔ ایک بہت ہی نادر مرکب جو قدرت کبھی کبھار ہی عطا کرتی ہے۔ صلاحیت اور محنت کا امتزاج ہے۔ عام طور پر یہ دونوں اتنی وافر مقدار میں ایک ساتھ نظر نہیں آتے مگر قدسیہ آپا میں ان تھک محنت' لگن' پِتّہ مارنے کی صلاحیتیں بھی

تھا ایثار اپنے آپ کو مٹانے کا اتنا حوصلہ..... مشکل..... بہت مشکل..... قدسیہ آپا آپ نے لکھنے والوں بلکہ کے لیے کیا امتحان کھڑا کر دیا۔

ایک روایتی مسلم خاندان کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی خارجی دنیا کے ساتھ Exposure حیران کن تھا۔ اس میں ریڈیو پاکستان کی سالانہ محفلِ موسیقی نہایت اعلیٰ سطح کی تقریب ہوتی تھی۔ قدسیہ آپا کے ساتھ ہم نے روشن آراء بیگم، پروین، مہدی حسن، سائیں مرنا، اقبال بانو، فریدہ خانم اور بہت سے مشاہیر کو سنا۔

اوپن ائیر تھیٹر کے بے مثال ڈرامے تھے۔ ہالی ووڈ کی شاہکار فلموں سے انہوں نے ہمیں روشناس کرایا۔ تب کی صحیح معنوں میں ایک تخلیقی تجربہ ہوتی تھیں۔ گون وِداونڈ، سپیس باؤنڈ، کم ستمبر، دا جائنز، فروم ہیرو ٹو اٹرنٹی، ایڈ شوز برواز، پروڈکشن اور ایسی درجنوں فلموں نے ہمارے فنی ذوق کو یہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس بھرپور تہذیبی اور ثقافتی دور تھا اور ہم قدسیہ آپا کے ساتھ اس میلے میں گھومتے پھرتے۔ عالم کی سیر میری صحبت میں اس طرح ہوتی ہے۔

اس وقت تک انہوں نے بہت کچھ لکھ رکھا تھا مگر اشفاق صاحب کی ہدایت کے مطابق چھپوانا شروع نہیں کیا دنوں وہ غنا بار روم میں تھے۔ پھر وہ آئے اور قدسیہ آپا کو چھین لے گئے۔ بانو قدسیہ بنا کر...... معاف کیجیے گا قدسیہ آپ کو میری یہ بات بارِ خاطر گزری ہو۔ مجھے معلوم ہے اشفاق صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے آپ تمام دنیا سے ہو گئیں۔ پھر آپ وہ بنیں جو انہوں نے آپ کو بنانا چاہا۔ جو آپ کے نزدیک عورت کا حاصلِ حیات ہے۔

بانو قدسیہ ہو کر آپ ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب جیسے بڑے اور باکرامت لوگوں کے حصار میں چلی گئیں۔ عجیب بات ہے ''گنڈریا'' ایسی کہانی لکھنے والا حال و قال کی دنیا میں نکل گیا اور قلمی ریاضت اور ایثار و خدمت کی سفیر عظیم الشان ادبی اثاثہ ہم ایسوں کو دیا مگر انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ انارکلی کی صدا۔ اے ترکِ غمزہ کہ مقابل نشستہ' اب بھی مضطرب کر دیتی ہے اور میں گزرے وقت کی گلیوں میں اتر جاتی ہوں۔

میری سب دعائیں، عقیدت اور محبت آپ کے لیے۔ قدسیہ آپا۔

(خالدہ حسین)

ایک خط جمیلہ ظفر نے مجھے لکھا۔ میرے ساتھ ناچنے والی جمیلہ شادی کے بعد کہیں کھو گئی۔ خالد فوج میں تھا۔ کشمیر میں شہید ہو گیا۔ پھر مجھے یہ خط ملا۔

Sunny Bano

Murree.

11-9-48

پیاری قدسیہ بہن

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ جواب کیا دوں۔ حیران ہوں دیکھ جو اللہ میاں کی بے نیازی۔ خواہ مخواہ میری دُنیا برباد کر ڈالی۔

سمجھ نہیں آتی کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ پھر بھی ہر دم اُس کی شکر گزار ہوں۔

میرا خالد مجھ سے چھین کر آخر خدا کو کیا مل گیا۔ بالکل.....نہیں آتا۔ کچھ سوچ نہیں سکتی۔ دل یہی کہتا ہے وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ رہے گا۔ بھلا مجھے اکیلا چھوڑ کر وہ کیسے جا سکتا ہے لیکن یہ میرا وہم ہے۔ سراسر پاگل پن۔ سب سمجھتی ہوں لیکن سمجھتے ہوئے نہیں سمجھتی۔

قدسیہ! وہ اپنے وطن اپنے اسلام پر قربان ہو گیا۔ اللہ یہ قربانی قبول کرے اور اس کے عوض کشمیر ہمیں مل جائے تو پھر بھی کچھ تسلی ہو جائے۔ وہ تو شہید ہے۔ تمہاری جمیلہ بہن اب ایک شہید کی دُلہن ہے۔ ہمارا ایمان ہمیں کہتا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ تو پھر وہ مجھے کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے کیوں ملنے نہیں آتا۔ میں تو اُس کا انتظار کر کر کے بھی تھک گئی۔ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں۔ کیسے پکڑ لاؤں۔ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ سب چپ ہیں کوئی نہیں بولتا۔

وہ تو مجھے ضرور یاد کرتا ہوگا۔ اپنے پاس بلاتا ہوگا لیکن کوئی اُس کے پاس جانے نہیں دیتا۔ مجھے جینے کی آرزو نہیں۔ زندگی کی تمنا نہیں لیکن کیا کروں۔ مجبور ہوں سخت مجبور۔ کیا معلوم تھا خالد اس قدر بے وفا نکلے گا۔ اتنی جلدی مجھ سے روٹھ جائے گا۔ وہ تو مجھ سے کبھی خفا نہ ہوا۔ معلوم نہیں ایکدم کیوں بدل گیا۔ جب آیا تو میں نے اُسے اس قدر بلایا۔ آوازیں دیں۔ روئی چلائی لیکن وہ چپکے لیٹے رہا۔ جیسے اُس کو کچھ خبر نہیں۔ بھلا اتنی بھی لاپرواہی کیا ہوتی۔ میں نے اب پکا ارادہ کر لیا ہے کہ چاہے وہ مجھے کتنا ہی بلائے۔ منتیں کرے۔ میں بھی اُس سے نہ بولوں گی۔ خوب ستاؤں گی۔ دیکھنا پھر وہ خود بخود سیدھا ہوتا ہے یا نہیں۔

بس اب لکھا نہیں جاتا۔ سر چکرا رہا ہے۔ خط لکھتی رہنا۔

بدنصیب

جمیلہ

جنوری 1951ء

31 دسمبر کی آدھی رات گزر جانے کے بعد روشنی کے ایک ٹکڑے نے میرے کمرے میں آ کر مجھے جگایا اور کہا ''میں تمہارے محبوب کے مقدر کا ستارہ ہوں۔'' میں نے لحاف سے سر نکال کر کہا ''چائے تھرموس میں پڑی ہے اور بسکٹ میرے میز کی دراز میں اور سینما کا پاس میری پتلون کی جیب میں رکھا ہے۔'' پھر میں نے اپنا منہ رضائی کے اندر کر لیا۔

کڑوی دوا میرے حلق میں یوں اُترتی ہے جیسے ریاضی داں لڑکی کا سنگیت کانوں میں!

دریائے جہلم میں چاند ستارے والے ایک روپے کو پڑے ہوئے دیکھ کر ایک کچھوے نے کہا ''اچھا تو سکندر

[illegible] چلا گیا!"

جب زندگی کے سارے باب بند ہو جاتے ہیں اور فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو موت چور دروازے سے [illegible] کہتی ہے "آؤ بھاگ چلیں۔"

میرے لیے میری ماں کا وجود اُس ٹائم پیس کی طرح ہے جسے میں نے مدت سے چابی نہیں دی لیکن جسے میں [illegible] صبح کو جاگنے کے لیے چابی بھی دیتا ہوں اور الارم بھی لگا دیتا ہوں۔

ایک ماں نو بچوں کی نگہداشت کر سکتی ہے لیکن نو بچے ایک ماں کی نگہداشت نہیں کر سکتے۔ (ترکی مقولہ)

اس سے بڑھ کر اور کوئی احمق نہیں ہو سکتا جو ساری دنیا کو اور اپنے باپ کو خوش کرنے کے ارادے رکھتا ہو۔

(La Fontaine)

1- مزنگ روڈ سے کینال پارک 24- ایس

ابھی ہمارے ایم۔اے کے امتحان نہ ہوئے تھے کہ ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

میری والدہ سانندہ والے گھر میں تشریف لائیں اور نادر شاہی حکم فرمایا کہ ''یہ گھر خالی کر دو۔ میں نے تمہارا انتظام کینال پارک میں کر دیا ہے۔ اچھی کھلی جگہ ہے۔۔۔۔تم لوگ بیڈمنٹن کا کورٹ بھی بنا سکو گے۔''

ان دنوں والدین کو جواب دینے کا رواج نہ تھا، نہ اپنے حکم کو مضبوط کرنے کے لیے کسی قسم کی تاویل ہی دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی بوریا بستر باندھ 24- ایس کینال پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیل روڈ سے جو راستہ گلبرگ کی طرف جاتا ہے، اُسی پر نہر کے پُل سے گزرتے ہی دائیں ہاتھ ایک راستہ نہر کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ دوسرے راستے سے کینال پارک کی بستی شروع ہو جاتی ہے۔

ایک سڑک کینال پارک کی کوٹھیوں سے گزر کر جاتی ہے۔ دوسرا راستہ کچا تھا اور کچھ دوکانوں سے ہوتا ہوا آگے چل کر پکی سڑک سے مل جاتا تھا۔ میں اسی راستے سے شہر جاتی تھی۔ یہی سڑک اور کچا راستہ مل کر ہمارے 24- ایس کینال پارک کے سامنے سے گزر کر آگے بازار میں جا نکلتا تھا۔

24- ایس کینال پارک ایک چھ کینال کی کوٹھی تھی، جس کا کالا پھاٹک تھا۔ جیسا پھاٹک اب 121- سی کے سامنے ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کالے پھاٹک کے ساتھ کچھ میری تقدیر کا گہرا لنک ہے۔ جب بھی میرے گھر کے آگے ایسا پھاٹک ہوتا ہے، میں بڑا تحفظ محسوس کرتی ہوں۔

یہ پھاٹک کھلتے ہی بائیں ہاتھ ایک بڑا سا درخت تھا۔ اس سے آگے ساری جگہ ڈھنڈار، اُجاڑ، جڑی بوٹیوں اور جنگلی پودوں سے اٹی ہوئی تھی۔ پھاٹک سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر کوٹھی تھی۔ ایک عرصہ سے بند رہنے کی وجہ سے عمارت خستہ حال تو نہ تھی لیکن بوسیدہ بوسیدہ سی لگتی تھی۔

سب سے پہلے چند سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ آتا جس کے فرش پر کالی اور پیلے موزیک کی شطرنجی بچھی تھی۔ اس برآمدے کے دونوں جانب کمرے تھے۔ بائیں ہاتھ عین شروع میں جو کمرہ تھا اُسے میں نے اپنا پڑھائی کا کمرہ بنا لیا۔

...ن دوسری طرف باورچی خانہ تھا، جو زینب اور لالو کی راجدھانی تھا۔ میرے آفس سے پیچھے ایک کمرہ اور غسل ...۔ غسل خانے کا دروازہ کھولیں تو تھوڑی سی خالی جگہ تھی، جس میں ایک لیٹرین بنی تھی، جسے زینب اور لالو استعمال ... تھے۔

میرے بیڈروم سے ملحق اور برآمدے کے پیچھے دو بڑے کمرے اور ان سے پیچھے تین چھوٹے کمرے تھے۔ ... کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور اس سے پیچھے گودام صورت کمرے میں ریزی نے چارپائی ڈال لی ... کے ساتھ والے کمرے میں کاٹھ کباڑ اور کھانے کے کمرے کے پچھلے کمرے میں زینب اور لالو رہتے تھے۔ ... نے کے سامنے ایک حوض تھا، جس میں دستی نلکہ لگا ہوا تھا۔

میں نے گھر کی تفصیل اس لیے بیان کی کہ آپ کو بتا سکوں کہ گھر کے ماحول میں رہائش گاہ بڑی اہمیت کی حامل ... اُس کے مکینوں پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ میں نے گھر میں قدم پڑتے ہی آفس پر قبضہ کیا۔ پھر اس سے ملحق اپنا بیڈروم ... چھین لیا۔ زینب اور لالو ایک طرح سے میرے ملازم تھے۔ میں نے کبھی انہیں ریزی بھائی کے لیے کوئی خصوصی ... نہیں دیکھا۔ ہر جگہ میں ہی اہم تھی۔

میں نے دیکھا ہے جن گھروں میں مجھ جیسی خود اعتماد عورتیں یا لڑکیاں ہوا کرتی ہیں، وہاں ایسی شیرنیوں سے ... خود اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔ جب وہ اپنی منوا نہیں سکتے تو اپنے اندر ہی کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ عموماً مردوں کا ... اور اُن کے ڈپریشن کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مردوں کی طرح ایسی عورتوں کو بھی اتھارٹی کا بہت شوق ہوتا ہے۔

میں نے بھی لائق بن کر اپنا رعب والدہ صاحبہ پر ڈال دیا تھا۔ وہ گھریلو خرچ کے پیسے مجھے دیتیں۔ جب بھی وہ ... سے آتیں، میرے ساتھ سوتیں۔ جب اُن کی تبدیلی ملتان ہو گئی تو وہ مجھے ملتان سے خط لکھتیں۔ ریزی کے لیے ... میں کوئی چھوٹا موٹا پیغام بھی نہ ہوتا۔ جب بھی ذکر ہوتا ضمنی یا سرسری ہوتا۔

ریزی بھائی طبعاً شریف آدمی تھے۔ مجھ سے زیادہ ذہین۔ ہر طرح سے زیادہ Deserving تھے۔ اسی ... اور محبت کے باعث تقاضا کرنا اُن کی فطرت میں شامل نہ تھا۔ نہ وہ مسابقت میں یقین رکھتے تھے نہ کبھی کسی چیلنج ہی کو ... تے تھے۔ جو کچھ زینب پکا دیتی کھا لیتے۔ جو کچھ میں کہہ دیتی فوراً مان لیتے۔

موی لیڈی میکلگن میں ہی رہ گیا تھا۔ میں صبح لالو کے ساتھ بغلی کچے راستے سے ہو کر جیل روڈ پر پہنچتی جہاں نہر ... سے کچھ پہلے بس سٹاپ تھا۔ یہاں سے بس سیدھی مال روڈ پر پہنچتی اور بھنگیوں کی توپ کے پاس والے بس سٹاپ ... میں اور لالو کالج پہنچتے۔

پنجاب یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہمارا فائنل کا امتحان ہوا۔ برآمدہ گزرتے ہی اندر بڑے ہال میں ہر طالب ... لیے ڈیسک اور کرسی تھی۔ غالباً یہ چوتھے پرچے والے دن کا واقعہ ہے۔

اشفاق احمد کو کاسہ بردار کا رول پسند تھا۔ وہ مجھ سے دونی مانگ کر کچھ اُدھار لے کر مجھے غالباً یہ یقین دلانا چاہتے ... مجھ سے کمتر ہیں۔ اُن کی یہ عادت میں نے دوسروں کے معاملے میں بھی راسخ دیکھی۔ وہ اپنے سے کمتر کو فرمائش ... نہ کچھ مانگتے۔ لڑکیوں سے بڑی عاجزی سے کچھ نہ کچھ پکا کر لانے کو کہتے اور پھر اس پکوان کو ایسی نیاز مندی سے

کھاتے گویا اس سے پہلے کبھی اس جنت کے میوے کا مزہ نہ چکھا ہو۔ تحفے لینے کا فن جیسا خاں صاحب کو آتا تھا۔ میں نے اس عاجزی کے ساتھ پھر کبھی کسی کو اس طرح تحفے قبول کرتے نہیں دیکھا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ غالباً چوتھے پرچے کا ذکر ہے.....

خاں صاحب کے دل میں وہی عاجزی در آئی۔ اپنا پن اُٹھا کر میری سیٹ تک آئے اور بولے ''آپ کے پین میں بلو بلیک انک ہوگی؟''

قطاروں میں چکر لگانے والے Invigilator نے انہیں دیکھا۔ یکدم مڑا اور دور سے آواز لگائی۔

''کیوں بھئی کیا ہے؟''

میری دوات اُٹھا کر اشفاق صاحب نے اُسے دکھائی۔ وہ بات سمجھ نہ پایا۔ قریب آ کر بولا۔

''کیوں بھئی آپ کو کیا چاہیے؟''

''سر! میرے پین میں سیاہی ختم ہوگئی ہے۔ میں ان محترمہ سے سیاہی مانگنے آیا تھا۔''

''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کمرہ امتحان میں آپ کسی سے بات نہیں کر سکتے؟''

بڑی معصومیت سے بھولے سے بن کر اشفاق احمد بولے۔ ''جی میں بات تو نہیں کر رہا۔ میں تو سیاہی مانگ رہا ہوں۔''

''آپ مجھ سے اپنی ضرورت کا ذکر کرتے۔ ممتحن اعلیٰ سے بات کرتے۔''

''سوری سر! نہ میرے پاس کوئی بوٹی ہے نہ ان کے پاس۔ آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔''

Invigilator نے غصے سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر یکدم اُس کے چہرے پر ملائمت آ گئی۔ ''آپ اشفاق احمد ہیں؟''

''جی..... جی!''

''آپ ادیب ہیں؟ آپ نے ''ایک محبت سو افسانے'' لکھی ہے؟''

''جی..... حسن اتفاق سے۔''

''بڑی خوبصورت کہانیاں ہیں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے واقعات سے آپ اتنی بڑی بڑی کہانیاں کیسے بنا لیتے ہیں؟''

جواب دینے کی نوبت نہ آئی۔ اس وقت ممتحن اعلیٰ ڈائس سے اُتر کر ہمارے پاس آ گئے۔

''کیا ہوا؟'' انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''یہ پین میں سیاہی بھرنا چاہتے ہیں۔ میں پاس کھڑے ہو کر سیاہی بھروا رہا ہوں کہ کہیں کوئی چیٹنگ نہ ہو جائے۔''

''Oh I see.''

سپریٹنڈنٹ واپس چلا گیا۔ خاں صاحب نے سیاہی بھری اور میرا شکریہ ادا کیے بغیر یوں مڑ گئے گویا دوات اُن

... ہمیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے آج تک کبھی پن میں سیاہی نہیں بھری۔ میرے لیے یہ بڑا
... ٹیکنیکل سا کام ہے۔ میں نے نہ جانے کیوں بڑی دیر تک اس دوات کو سنبھالے رکھا۔

ان ہی امتحانوں کے دنوں میں میرا پہلا تعارف خاں صاحب کے خاندان سے ہوا۔ پرچہ ختم ہونے پر ہم لوگ
... نکلے۔ ہال کے باہر برآمدے میں اشتیاق احمد خاں سے ملاقات ہوئی۔

"یہ میرا چھوٹا بھائی اشتیاق ہے۔ ہم سب اسے تقو کہتے ہیں۔ فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا ہے....."

تقو نے بڑی اُجلی سی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

خاں صاحب نے عجب اپنائیت سے میرے ہاتھ سے قلم کاغذوں کے نیچے رکھنے والا گتہ پکڑا اور اسے تقو کے
... دیا۔

"یہ قدسیہ میری ہم جماعت ہیں۔ تم انہیں کاکی کہہ کر پکار سکتے ہو۔"

نہ جانے کس طرح اشفاق صاحب میرا گھریلو نام جانتے تھے۔

مجھے کچھ پوچھنے کا وقت نہ ملا کیونکہ تقو نے بڑی محبت سے پوچھا "شقو پرچہ کیسا ہوا؟"

اب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ اشفاق صاحب کا نِک نیم شقو ہے۔

"بس ہو گیا۔ چپ چاپ چلے آؤ۔ ان کا ملازم غالباً گورنمنٹ کالج میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہاں تک جانا
... تو نہیں ہوتا ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں۔"

تقو بڑی خاموشی کے ساتھ ہم دونوں سے دو قدم پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اُس نے شقو اور کاکی سے کوئی بات نہ کی۔
... صاحب اور قدسیہ ہی نے آپس میں کوئی رابطہ قائم کیا۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہ پوچھا کہ کون کون سے سوال کیے گئے اور پرچہ
... گیٹ کے قریب ہی لالو منتظر نظر آیا۔ خاں صاحب نے تقو سے میری چیزیں پکڑ کر لالو کو پکڑا دیں اور دونوں بھائی
... گئے گویا سرے سے واقف ہی نہ ہوں۔

اشتیاق ابھی فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ وہ کاکول میں کیڈٹ تھا اور انڈر ٹریننگ تھا۔ وہ اپنے خاندان سے نیا نیا
... سخت زندگی کی چھاپ ابھی اُس کے چہرے پر نہ تھی۔ چھ فٹ دو انچ لمبا۔ گورا چٹا سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں
... خاموش رہتا تو امریکن لگتا۔

اس پہلی ملاقات میں تقو اور میری دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔ ہولے ہولے یہ دوستی گہری ہوتی گئی۔ وہ جہاں بھی
... ضرور لکھتا اور میں بھی اُس کے خط کا جواب اہتماماً دیتی۔ ڈیڈی جی سے محبت کا رشتہ ضرور تھا لیکن اس میں احترام
... تقو اور ناہید سے بڑی بے تکلفی تھی۔ وہ ساری زندگی میرا رازداں، دوست، بھائی، مددگار رہا۔ ایک عاشق کا
... ہو سکا باقی سارے رشتے مضبوطی سے قائم رہے۔ غالباً یہ سکھوں کے ساتھ رہنے کا اثر تھا کہ ہم دونوں ایسے
... تھے جو سکھ خاندانی نظام کرشن چوڑا کی بازگشت تھے۔

... امتحانوں کے بعد کی بات ہے۔ میں بڑے درخت کے جھولے پر تھی جس وقت کالا پھاٹک ہولے سے کھلا۔
... کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ہمارے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت نہ تھی۔ میری والدہ ان دنوں ملتان میں انسپکٹرس آف

سکولز تھیں۔ اُنہوں نے نادر شاہی حکم دے رکھا تھا کہ شہر میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ جب تک میں موجود نہ ہوں کسی سے دوستی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ریزی کو بھی آرڈر دے رکھا تھا کہ کسی دوست کو گھر بُلانے کی تکلیف نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

پھاٹک کُھلا۔ سائیکل کا ایک پہیہ اندر گھسا۔ پھر ہینڈل پر ایک سفید ہاتھ نظر آیا جس پر سنہری بال تھے۔ سائیکل اندر آئی۔ خاں صاحب نے احتیاط کے ساتھ اپنے پیچھے کالا پھاٹک بند کر دیا۔ میرا جھولا رُک گیا۔ میں حیرانی سے سراپا استقبال بن گئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ 1- مزنگ روڈ کی تیسری منزل پر رہنے والے کو میرا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔ پھاٹک کے ساتھ دائیں طرف اینٹوں کا ازل روڑی ملا ملبہ پڑا تھا۔ خاں صاحب نے سائیکل وہاں کھڑی کر دی اور درخت سے گھر یلو قسم کے جھولے کی طرف آ گئے۔

''السلام علیکم۔۔۔'' چھوٹی سی بے ترتیب باڑ اُلانگ کر وہ قریب آتے ہوئے بولے۔

''جی السلام علیکم۔۔۔''

''آپ جی کا بہت استعمال کرتی ہیں۔ میں نے کالج میں بھی یہ محسوس کیا تھا۔۔۔''

''جی۔۔۔ جی۔۔۔''

میں اُنہیں بتا نہ سکی کہ خوفزدہ لوگوں کے پاس جی جی کی تکرار ایک نوعیت کی ڈھال ہوا کرتی ہے۔ مراثی، مزارعہ، یتیم، مسکین، ملازم کے پاس یہ ایک قسم کا Defense mechanism ہے جسے استعمال کر کے وہ جاگیردار، نمبردار، آمر، ڈکٹیٹر، مالک غرضیکہ ہر قسم کے اپنے سے برتر کے دل میں جذبۂ ترحم اُبھارتا ہے اور کسی کے رحم و کرم پر تکیہ کر کے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچاتا ہے۔

میں نے شفتو کو جھولے کے پاس بٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ یہاں دو تین بوسیدہ سے ڈگڈگی نما موڑھے پڑے تھے۔ میں برآمدے کی طرف چلی۔ وہ مودب انداز میں پیچھے پیچھے ہو لیے۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر ہم برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہاں فرش تو موزیک کا تھا لیکن اس کا ڈیزائن کالے اور پیلے رنگ کی شطرنجی کا تھا۔ یہاں خوبصورت آرام دہ فیب لکڑی کی بنی ہوئی گول گول پشت کی کرسیاں تھیں۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور جی کہنے سے گریز کیا۔

''مجھے ریزی کی تلاش ہے۔۔۔۔ آپ اُسے بُلا دیں گی؟''

آج تک پرویز کو کسی نے ریزی نہ کہا تھا۔ اب ایک لمحہ میں اُس کا نام ہمیشہ کے لیے ریزی پڑ گیا۔

''وہ تو جی گھر پر نہیں ہیں۔''

''کب تک آئے گا؟ مجھے اُس سے ایک سرورق بنوانا تھا۔''

''بس جی آتا ہی ہو گا جی۔۔۔۔'' میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ حالانکہ مجھے ریزی کی آنیاں جانیاں کبھی ٹھیک طور پر معلوم نہ ہو سکیں۔

''میں جی پوچھ کر بتاتی ہوں۔'' میں اُٹھ کر باورچی خانے تک گئی۔

زینب دروازے میں کھڑی تھی۔

میں اندر چلی گئی...... ”ذرا لالو کو بازار بھیج کر نمک پارے اور برفی منگوالو۔ ساتھ چائے بھی بھیج دینا۔“

”یہ کون ہے صوفی صاب؟“

”میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ پرویز بھائی کا پوچھنے آئے ہیں۔“

”اتنے سوہنے صوفی صاب، اتنے سوہنے...... ہائے ربا اتنے سوہنے۔“ زینب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

وہ چپ ہوگئی۔ غالباً اس وقت زینب نے کوئی دعا مانگی ہوگی جو بعد میں میرے کام آئی۔

”دیر نہ کرنا...... یہ رُکنے والے نہیں... جلدی لالو کو بازار بھیجو۔“

کینال پارک کا بازار بالکل چینیز وصورت تھا۔ اس میں چھوٹی موٹی دکانیں اور سستے سودے تھے۔ ایک حلوائی کی بھی تھی جس کا بنیادی کام دہی دودھ بیچنا تھا۔ لیکن وہ اپنی دکان کی عزت بڑھانے کے لیے نمک پارے اور برفی بھی رکھتا تھا۔ خاں صاحب نے یہ برفی اور نمک پارے اس طرح کھائے جیسے من وسلویٰ کھا رہے ہوں اور یہ نعمتیں انہوں نے پہلے کبھی نہ چکھی ہوں۔

”آپ کو علم ہے کہ میں مزنگ روڈ پر رہتا ہوں؟“

”جی...... پتہ ہے۔“

”کیا آپ جانتی ہیں کہ جب ہم پاکستان آئے تو پہلے ہم اپنی خالہ رشیدہ کے پاس ٹھہرے تھے لیکن جلد ہی ہمیں مزنگ روڈ کا پتہ چلا۔ آپ کو پتہ ہے ہم...... بے سروساماں تھے۔ تقو اور میں چھوٹے تھے۔ جو بھائی کراچی میں تھے۔ ...ی وال میں...... بابا جی میرے والد ساری پونجی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اقبال بھائی نے بڑی ہمت کی۔ وہ چوری چھپے بکر منڈی جاتے۔ ایک آدھ بکرا خرید کر اپنے کندھوں پر سوار کرتے اور پھر اسے گھوم پھر کر بیچتے اور گھر آ کر ساری قیمت ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔“

میں بلاٹنگ پیپر کی طرح ساری انفرمیشن چوس رہی تھی۔

”آپ نہیں سمجھ سکتیں کتنی مشکلات تھیں۔ میری بڑی آپا فرخندہ حاملہ تھیں۔ اُن کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں ہمارے پاس چھوڑ کر لندن جا چکے تھے۔ بالو بھائی کے پیسوں سے گزارا نہ ہوتا تھا۔ پھر میں نے سوچا......“

”مجھے سمجھ آئی کہ یقیناً اقبال احمد ہی بالو بھائی ہیں۔“

”میں نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ میں کوئی نوکری تلاش کر لوں۔ مجھے پتہ چلا کہ والٹن کیمپ میں ایک کلرک کی اسامی خالی ہے۔ میں بڑے رعب سے اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچا۔ لیکن کلرک نے ڈگری دیکھ کر کہا، بھائی یہاں تو میٹرک پاس آدمی چاہیے۔ دوسرے دن میں اپنی دسویں کی ڈگری لے کر گیا اور مجھے نوکر رکھ لیا گیا۔“

میرا دل ترس سے بھر گیا لیکن میں نے منہ سے کوئی اظہار نہ کیا۔

وہ کہتے گئے...... ”والٹن میں ان دنوں ایک بہت بڑا مہاجر کیمپ تھا۔ ٹولے، فرد، قافلے اُجڑے پجڑے لوگ آئے ہوئے تھے۔ حیران پریشان پڑاؤ ڈال کر سارے کیمپ میں گھومتے پھرتے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ انہیں اپنے بچھڑے ہوئے رشتہ داروں کی تلاش تھی۔ چھت سے محروم یہ لوگ گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ روزگار نہ تھا اور انہیں معلوم نہ تھا کہ

روزی کا وسیلہ کیسے بنے گا؟

''میں کیمپ میں معمولی کلرک تھا۔ میری ڈیوٹی تھی کہ میں مہاجروں کے نام، پتے، کوائف اور اُن کی شکایتیں اپنی نوٹ بک میں لکھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے ایک مائیکروفون مل گیا۔ میں اس پر اہم اناؤنسمنٹ کرنے لگا۔ پھر سلسلہ بڑھا اور مجھے ملتان کیمپ بھی جانے کا حکم ملا۔

''ہوائی جہاز پر دورے ہونے لگے۔ یہ میرے پہلے ہوائی سفر تھے اور میں ان سے بہت مسحور ہوتا تھا۔ صرف ایک مشکل تھی میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ 1- مزنگ روڈ سے والٹن پیدل جانا پڑتا۔ واپسی پر بہت تھک جاتا.....''

وہ لمحہ بھر کو رُکے تو میں نے سوچا بھلا یہ فاصلہ کتنا ہوگا؟ میں لاہور کی سڑکوں، یہاں کے محلوں سے قطعی ناواقف تھی۔ اس لیے اس فاصلے کا اندازہ لگانا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔

''والٹن میں ہی ممتاز مفتی مجھ سے ملے۔ بڑا بھلا آدمی ہے۔ وہ بظاہر اکھڑ لگتا ہے لیکن دل رکھنے کی ریت اُس سے زیادہ کسی کو نہیں آتی۔''

بات کرنے والا داستان گو بلا کا سحر البیان تھا۔ میں سنی سنائی سے گزر کر والٹن کیمپ میں پہنچ گئی اور قریب سے ممتاز مفتی کو دیکھنے لگی۔

وہ مجھے Entertain کر رہے تھے۔ بار بار وہ پھاٹک کی طرف اس طرح دیکھتے کہ مجھے یقین ہو جائے وہ واقعی ریزی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھی کسی طرح اُن کی گفتگو سے آؤ بھگت کرنی چاہیے۔ میں اندر گئی اور اپنی ایک پسندیدہ البم اُٹھا لائی۔

''یہ البم میں نے بڑی مشکل سے تصویریں اکٹھی کر کے بنائی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے؟''

''آپ کی فیملی البم ہے؟''

''جی نہیں یہ اُن فلمی ایکٹر اور ایکٹرسوں کی تصویریں ہیں جو مجھے جی جان سے پسند ہیں۔ جب ہم دھرمسالہ میں ہوتے تھے تو وہاں ایک سینما گھر ہمالہ ٹاکیز ہوا کرتا تھا۔ ان کا بل بورڈ کوتوالی بازار کے چوراہے میں لگتا تھا۔ اس پر لکھا ہوتا ''آجسٹکو.....'' مجھے کبھی سمجھ نہ آئی کہ یہ آجسٹکو کیا چیز ہے۔''

وہ ہلکا سا مسکرائے.....

''ہمالہ ٹاکیز کے مالک ہمارے پڑوسی تھے۔ یہاں سے مجھے اور ریزی کو فلمیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔''

''مزے تھے تمہارے۔ مفت فلمیں دیکھنے کو ملتی تھیں.....'' شفو جی نے کہا۔

''ناں ناں جی میری امی نے بھائیہ صاحب کو بڑی شدت سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کو بغیر ٹکٹ خریدے ہال میں نہ جانے دیں۔'' میں نے جلدی سے ٹوکا۔

''ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ سینما کے مالک آپ کے ہمسائے تھے۔''

''ہمسائیگی اور چیز ہے ٹکٹ اور معاملہ تھا۔''

البم کے پہلے صفحے پر کندن لعل سہگل کی تصویریں تھیں۔ کندن لعل سہگل نے پہلی مرتبہ فلم ''دیوداس'' میں رول

... دیا کہ راس کماری سے لے کر پشاور تک سینما کے شائقین عش عش کر اُٹھے۔ اس فلم میں پارو کا رول دُبلی پتلی ... نے ادا کیا ... بڑوا نے اُس کے شوہر کا رول ادا کیا تھا۔

... کے عجیب کام ہیں۔ وہ عروج کے مقامات بدلتا رہتا ہے اور زوال کو بھی کسی ایک مقام یا شخص پر مستقل نہیں ... بھارت میں بھی فلمی عروج کی داستان کچھ اسی طرح تھی کہ سب سے پہلے بمبئی ٹاکیز نے تہلکہ مچایا۔ ''اچھوت ... جیسی فلمیں بنائی گئیں، جس میں دیوکا رانی نے شودر لڑکی کا رول ادا کیا۔ ان کے ساتھ ایک کھیپ بڑے ایکٹروں اور ... بھی پیدا ہوگئی۔

پھر گویا اُوپر سے اشارہ ہوا اور ساری شہرت سارا عروج نیو تھیٹرز کی شکل میں بمبئی سے کلکتہ منتقل ہوگیا۔ کندن ... سہگل کو ... ملک کی آواز نے ڈھانپ لیا۔ مدھو بالا، سلوچنا کو بھول کر لوگ کانن بالا کے گن گانے لگے۔ میں خود کانن ... بہت بڑی فین تھی اور اُس کی ''جواب'' فلم نے مجھ پر جادو کر رکھا تھا۔

سہگل جب دیوداس کے روپ میں گاتا...... ''دُکھ کے اب دن بیتت ناہیں'' تو دل میں شام سی پڑ جاتی۔

کانن بالا جب مست بھرے لہجے میں گاتی......

''جانے نہ دیں گے نہ جانے دیں
لیٹ رہیں گے راہوں میں''

تو گویا ہیروئن کے ساتھ ساتھ ٹکٹ خریدنے والے بھی ہیروز کو روکنا چاہتے۔

کندن لال سہگل ایک مرتبہ دھرمسالہ آئے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ وہاں ہم اُن سے اُسی عقیدت ... سے ملے جس طرح سارے فین (عقیدت مند) جاتے ہیں۔ سہگل اپنا ایک ٹی سیٹ بیچ رہے تھے۔ امی نے وہ ٹی ... سیٹ ... روپے میں خرید لیا۔ عجیب بات ہے کہ وہ سیٹ میرے پاس C-121 تک رہا اور بالآخر میں نے اسے ایک ایسے ... کے نذر کیا جو سہگل کی یادیں جمع کر رہا تھا۔

میں یہ البم خاں صاحب کو پوری جانکاری، دلچسپی اور توجہ سے دکھا رہی تھی لیکن وہ بظاہر متوجہ لیکن بہ باطن وہ کسی ... میں تھے۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولے...... ''یہ تو بڑی اچھی ہابی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور سنجیدہ قسم کی ... ہے۔ آپ کے بھائی تو بہت اچھے آرٹسٹ ہیں۔ آپ کا کوئی ایسا مشغلہ؟''

''اشفاق صاحب میں...... کچھ کہانیاں لکھ لیتی ہوں۔ ایسے ہی...... ٹامک ٹوئیاں...... کچھ مہاجر کیمپوں سے ... کہانیاں...... کچھ اردگرد کا تجربہ۔''

''واہ یہ بات ہوئی ناں...... یہ شوق تو بہت ہی مثبت ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی کہانیاں دکھا سکتی ہیں؟''

میں اپنے آفس میں چلی گئی...... میز کی دراز سے میں نے وہ پیلے کاغذ نکالے جن پر میری کہانیاں رقم تھیں۔ ... وہ ''فاطمہ'' کہانی تھی۔ بہت بعد میں اس کہانی کا ڈرامہ ''صبح کا تارا'' بنایا گیا۔ جسے پہلی مرتبہ آغا ناصر نے ... اور انور سجاد نے اس میں ہیرو کا رول کیا۔

جب میں کاغذوں کا پلندہ لے کر آئی تو خاں صاحب بڑی بے تکلفی سے لالو سے مشغول گفتگو تھے۔ اُن کا انداز

ایسا تھا گویا وہ برسوں سے لالو کو جانتے ہوں۔ مجھ سے اُنہوں نے افسانے پکڑ لیے اور بڑی دلچسپی سے ورق گردانی کرنے لگے۔ ایک مبتدی کی طرح میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

''کاکی! آپ صفحہ نمبر نہیں لکھتیں.....''

میں نے کبھی پوری توجہ اور اہتمام سے یہ کام نہ کیا تھا۔ یہ تو وقت کٹی کا ایک شغل تھا۔ اچانک یہ افسانے ایک نئے رابطے کا سنگِ بنیاد بن گئے۔

''جی بات یہ ہے کہ میں نے جلدی میں کچھ ترتیب سے کاغذ اکٹھے نہیں کیے۔''

''دیکھیے کوئی جلدی نہیں، آرام اطمینان سے الگ الگ کر کے افسانے مرتب کر لیجیے۔ میں پھر آ جاؤں گا ریزی تو ابھی آیا نہیں، اچھا پھر سہی۔''

کالے پھاٹک کے پاس کھڑی سائیکل باہر نکالی۔ اس کے سوار نے نہ مڑ کر ٹاٹا بائی بائی کرنے کی کوشش کی کوئی الوداعی جملے ہی کہے۔ بس ایک دردناک سی خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ پھر مری سے اُن کا خط آیا کہ وہ جلد لاہ آئیں گے اور افسانے ضرور دیکھیں گے۔

ایسے ہی ہوا۔ جب دوبارہ وہ ہمارے گھر آئے تو چند افسانے اپنے ساتھ لے گئے۔ میری حیرانی کی انتہا نہ جب میرا پہلا افسانہ ''واماندگیٔ شوق'' ادبِ لطیف میں چھپ گیا۔ وہ یہ رسالہ دستی لے کر میرے پاس آئے۔

''لیجیے مبارک ہو۔ ادبی سفر شروع ہو گیا۔''

رسالے کے اوپر لکھا تھا ''کاش میں بھی ایسا ایک افسانہ لکھ سکتا!''

کہانی پر میرا نام بانو قدسیہ لکھا تھا۔ یہ نام خاں صاحب نے اپنی طرف سے عنایت کیا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرا یہی نام شہرت پکڑتا گیا اور میں اپنا آبائی نام قدسیہ چٹھہ خود بھی بھول گئی۔

یہ ''نام'' کی بھی عجیب کہانی ہے۔

میری والدہ نے کبھی مجھے قدسیہ کہہ کر نہ پکارا۔ وہ مجھے کاکی اور ریزی بھائی کو کاکا کہتی تھیں۔ لیڈی میکلیگن میری سہیلیاں جمیلہ ظفر، امینہ ملک، انور ملک اور آپی اقبال ملک مجھے ''کو'' کہہ کر پکارتیں۔ میں بھی اس نام پر خوش مفتی جی مجھے قدسی پکارتے رہے لیکن شہاب صاحب نے جب مجھے بانو کہہ کر بلانا شروع کیا تو ہر نام ماند پڑ گیا۔ اب یہی نام مستعمل ہے۔ چھوٹے بڑے مجھے ''بانو آپا'' کہہ کر پکارتے ہیں اور میں اس نام کے ساتھ اندر باہر بڑی مناسبت محسوس کرتی ہوں۔

ایک دفعہ بانو قدسیہ بن جانے کے بعد مجھ میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی، لیکن شقو میرے لیے پریشان تھے جانتے تھے کہ میری اردو کمزور، مشاہدہ کمزور تر اور تخیل بھی واجبی سا ہے۔ لیکن اب اُن کے پاس کینال پارک آنے کا بہ اچھا جواز پیدا ہو گیا۔ وہ مجھے کبھی کبھار کچھ لکھنے کے لیے دے جاتے اور پھر اس ورق کو بڑے احترام سے لے جاتے کرنے کا یہ انوکھا ڈھنگ خاص اُن کی اختراع تھی۔

اسی جذبے کے تحت اُنہوں نے بعد میں مجھے ''داستان گو'' کا ایڈیٹر بنا دیا۔ کبھی کبھار وہ ''من چلے کا سودا''

ہفتے مجھے ایک آدھ سین کی ون لائن پکڑا دیتے اور لکھنے کی فرمائش کرتے۔ یہ سب کچھ میرا مان بڑھانے کے لیے تھا۔ اس سے ان کا اپنا کوئی فائدہ ملحوظ خاطر نہ تھا۔ بس میری خود اعتمادی اور انا کے لیے بڑھاوا تھا۔

یہاں اشفاق احمد کی ایک مشکل سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ ہمارے گھر کا قریباً فرد بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ جونہی وہ زیادہ اپنائیت محسوس کرتے۔ نمک پارے اور برفی کھاتے ہوئے انہیں محسوس ہوتا کہ وہ اب دور نہیں جا سکتے۔ پھر بڑی شدت سے وہ فرار کا راستہ اختیار کرتے۔

1950ء سے 1955ء تک بڑے طوفانی سال ہیں۔ میں کبھی ملتان چلی جاتی تو اُن کے خطوط میرا تعاقب کرتے۔ میں ملتان سے آتی تو چند بے ربط سی ملاقاتیں ہوتیں۔ پھر وہ کبھی جہلم، کبھی مری، کبھی تراڑ کھیل میں ریڈیو کی نوکری کرنے چلے گئے لیکن دور بھاگنے کے باوجود وہ اس تعلق سے کلی طور پر شفایاب نہ ہوئے۔ گریز کا پہیہ انہیں کیتال پیچھے سے دُور بھگاتا رہا لیکن لوٹ آنے کے لیے راستہ چھوڑتا رہا۔

ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ وہ جہاں بھی گئے ہمیشہ خط لکھتے۔ یہ خط جذبے سے عاری اور بیانہ موشگافیوں سے بھرے ہوتے لیکن اندر ہی اندر وہ سوچ رہے تھے کہ یہ دوری یہ فاصلہ کافی نہیں۔ انہیں ضرور کسی لمبی اُڑان پر جانا ہوگا تاکہ گھر والوں کی روایات اور وفاداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔ گویا اُنہیں ایک ایک قطرے کا مجھے اور اپنے گھر والوں کو حساب دینا تھا۔ وہ اس سوچ میں حق بجانب تھے کہ اب وہ کسی کا دل نہیں دُکھا رہے۔

دراصل اشفاق احمد نے بڑی کرب کی زندگی گزاری اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ کسی کی دلآزاری کو سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اُن پر یہ حقیقت نہ کھلی کہ دل شکنی زندگی کا ایک وصف ہے۔ اللہ میاں کبھی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر آفت بنا کر نازل کر دیتا ہے، کبھی رحمت بنا دیتا ہے۔ یہ سب اُس کے کھیل ہیں۔

اس حقیقت کو طائف کے واقعے یا رحمتِ دو عالمؐ پر کوڑا پھینکنے والی مائی کے حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ ہمارے نبیؐ نے کبھی ان لوگوں کو موردِ الزام نہیں سمجھا بلکہ یہی جانا کہ بیچارے لوگ معیشت کے ہاتھ میں اس آشوب کا ہتھیار بنے ہوئے ہیں۔

اس کو کیا کیا جائے کہ قدم قدم پر ہر لحہ ہر موسم اور مقام پر دل ٹوٹتے ہیں۔ کبھی کسی غلط فہمی کے تحت کبھی خوش فہمی کے باعث دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی حسد حق تلفی کا باعث بنتا ہے کبھی طیش۔ انسانی جذبوں نے قلب اور نفس میں جو ہڑبونگ مچا رکھی ہے دماغ کی شریانیں بیرون کی جن تبدیلیوں سے متاثر ہوا کرتی ہیں، وہ سب حالات کی تبدیلی سے شکست و ریخت کا باعث بنتے ہیں۔

شاید اسی لیے تمام مسلک خواہش سے دُور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے ضرورت بھر کھانا، حدود کے اندر مقید جنس، انکساری کے ہمراہ ضرورت بھر عزتِ نفس کا حصول، رزقِ حلال کی یافت اسلامی تعلیم ضرور ہے لیکن یہ عام انسان کے بس کی نہیں۔ خواہش ہمیشہ ان ضروریات کو بڑھا دیتی ہے اور انسان اس خواہش کے حصول میں دلآزاری کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔

خاں صاحب نے ایک بار اپنے مسائل سے ستانے کا وقفہ لیا اور جہلم چلے گئے۔ یہاں پرائم گلاس فیکٹری تھی

جس کے مالک سعید احمد خاں تھے جو اماں سردار بیگم کے کزن تھے۔ یہ پاکستان کی پہلی گلاس فیکٹری تھی۔ Amroc سے وجود میں آئی تھی۔ گیس سارے شہروں میں پہنچی لیکن جہلم محروم رہا اور بالآخر گیس نہ ہونے کی وجہ سے فیکٹری بند ہوگئی۔

ان دنوں پرائم گلاس فیکٹری کو گیس نہ ملی تھی اور وہ تیل کی بھٹیوں سے کام کر رہے تھے۔ یہاں جتنی مرتبہ خا صاحب گئے اُنہوں نے مجھے خط لکھے جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اُنہیں اپنے خاندان کے لوگوں سے کس قدر محب تھی اور ان سے بانہہ چھڑانے کے بعد وہ کس کرب سے گزرے ہوں گے۔

دراصل پٹھانوں میں جو کلچرل یک جہتی ہے وہ انوکھی چیز ہے۔ وہ کبھی بھی اپنوں کے قرب سے چھٹکارا حا کرنا نہیں چاہتے۔ اگر بوجوہ بچھڑ بھی جائیں تو چھپکلی کی کٹی دم کی طرح پھڑکتے رہتے ہیں۔ وہ عم زاد کی محبت سے چھ حاصل نہیں کر سکتے۔ اُنہیں حفاظت کا احساس اپنے رشتہ داروں سے گھلے ملے رہنے سے ملتا ہے۔

غیر پٹھانوں کے ساتھ کھانے پینے، اعتقادات، رسم رواج کا Osmosis جاری رہتا ہے لیکن وہ غیر پٹھانو میں ضم نہیں ہو سکتے۔ ہر پٹھان غیر پٹھان کے ساتھ دوستی تو کر سکتا ہے، محبت کا مرتکب ہو سکتا ہے، قلب میں سیڑھی لگا کر سکتا ہے لیکن غیر پٹھان کے ساتھ مکمل طور پر کمفرٹیبل نہیں ہو سکتا۔

اگر مجھے درست یاد ہو تو تراڑ کھیل میں یوسف ظفر، ممتاز مفتی، عمر صاحب (جنہیں خاں صاحب عمر بکری کرتے تھے کیونکہ عمر ہر پہاڑی پر بکری کی طرح چڑھ جاتے تھے) یہ بھی سنی سنائی سمجھیے کہ یہ چاروں مری سے ایسے پروگرا نشر کرنے میں مشغول تھے جو پاکستانی نقطہ نظر کی وضاحت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کر سکیں۔

''ہم آ گئے'' پروگرام نشر ہونے لگا۔ اس پروگرام کی خوبی یہ تھی کہ پندرہ منٹ پہلے جو پروگرام بھارت سے اُس کا جواب خاں صاحب ڈنکے کی چوٹ لکھتے اور جوابی حملہ اس قدر منہ زور اور سخت ہوتا کہ غالباً ہندوستان والے سارا اس کا جواب ہی سوچتے رہتے۔

تراڑ کھیل میں ایک ٹرک میں ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ یہاں کا سماں عجیب تھا کہ ٹرک میں باہر کے شور سے چھٹکارا پانے کے لیے مائیکروفون اور ایکٹر اپنے اوپر رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ یہ اختراع اس لیے کی گئی تھی کہ ہندوستان سے ہونے والے پروپیگنڈہ پروگراموں کا فوراً جواب دیا جائے۔ خاں صاحب کے ذمے ''ہم آ گئے'' کا سکرپٹ لکھنا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا پروگرام سنتے۔ ساتھ ساتھ حاضر جوابی سے سارے اعتراضات کا جواب رقم کرتے۔ جونہی بھا پروگرام بند ہوتا تو تراڑ کھیل سے اناؤنسمنٹ ہوتی..... ''ہم آ گئے!''

اس پروگرام میں مشہور آرٹسٹ محمد حسین اور تاج صاحب پیش پیش تھے۔ کبھی خاں صاحب بھی صداکا کرتے لیکن زیادہ تر وہ سکرپٹ ہی لکھتے تھے۔ ممتاز مفتی بھی وہیں تھے اور وہ بھی سکرپٹ لکھا کرتے تھے۔ خوا صداکاروں میں جمیلہ اختر سے خاں صاحب کی یہیں ملاقات ہوئی تھی۔ خاں صاحب ازل سے مخنتی تھے۔ اُن کے لیے سے دوری، کانے پھاٹک والی سے فاصلہ، اپنی تنہائی کا غم اس پروگرام کے سامنے دھندلا جاتا۔

یہیں رہ کر غالباً سب سے پہلے اُن پر یہ بات واضح ہوئی کہ اُن کے دل میں پاکستان کی محبت دائمی ہے۔ محبت پھر جوان ہو کر ''تلقین شاہ'' پروگرام میں اُبھری جو پورے 39 سال نشر ہوتا رہا۔ اس پروگرام سے اُن کی وفادار

[illegible] ہے۔ اُن کی محنت طلبی کا ایک عجیب واقعہ بھی ہے کہ جب بابا جی محمد خاں اس جہاں سے چلے گئے تو ابھی اُن کا جنازہ گھر [illegible] ور خاں صاحب ماتم داروں سے چھپ کر ''تلقین شاہ'' لکھ رہے تھے۔

پاکستان سے والہانہ محبت نے 1971ء کی جنگ میں ''داد ولوہار'' کا روپ دھارا۔ اس پروگرام کو وہ لاہور سے [illegible] کرتے تھے اور اس میں صداکار بھی شقو ہی تھے۔

خاں صاحب شاید تراڑکھیل سے جلد واپس نہ آتے لیکن ایم اے کا رزلٹ نکل آیا۔ ہم دونوں پاس ہو گئے [illegible] انہوں نے مجھے مبارک باد کا تار بھیجا تو مجھے لگا جیسے میری محنت ٹھکانے لگی۔ امتحان میں خاں صاحب فسٹ آئے۔ [illegible] رے نمبر پر آئی لیکن مجھے ایک بار بھی اس بات کا رنج نہ ہوا۔

وہ ترنت ہی لاہور واپس آ گئے۔

کالا پھاٹک کھلا...... اشفاق صاحب نے اپنا ہوپر سائیکل لال بجری کے ساتھ دائیں کونے میں رکھا۔ سیڑھیاں [illegible] ھ کر برآمدے کی آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر یوں بیٹھے جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر سفر سے گھر لوٹتا ہے۔

ایک لمبا وقفہ خاموشی کا گزرا۔ پھر نہ تو کوئی بات تراڑکھیل کی ہوئی نہ امتحانوں کے متعلق دہرائی گئی۔ اشفاق [illegible] نے بڑی لجاجت سے کہا ''دیکھیے میری اماں کو شوق چڑھا ہے کہ وہ میری کامیابی کی خوشی میں دعوت کریں۔ آپ [illegible] روڈ آئیں۔ کل رات قریباً سات آٹھ کے درمیان۔''

میری والدہ ملتان میں تھیں اور اُن کی اجازت کے بغیر میں کہیں جا نہ سکتی تھی۔ ویسے بھی خوف میری شخصیت کا [illegible] ہے۔ خود بخود پھلتا پھولتا ہے۔ خود بخود دیوانہ وار مجھ پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی میں ابھی لڑکیاں اتنی ماڈرن نہ [illegible] کہ یوں آزادانہ گھوم پھر سکیں۔ ابھی تو سہیلیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ پتہ [illegible] یں مجھے خیال آیا کہ میں 1- مزنگ روڈ جا کر اپنے آپ کو بے وقعت اور Cheap ثابت کروں گی۔

''مشکل یہ ہے کہ میں تو آپ کے گھر نہیں آ سکوں گی۔ آئی ایم سوری، یہ ممکن نہیں۔''

شقو فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے...... ''میں تو اماں کو مرغیاں خرید کر دے آیا تھا۔''

میرا انکار سن کر غیرت مند پٹھان بچے نے اصرار نہ کیا۔ سیڑھیاں اُترے ہوپر سائیکل سنبھالا، کالا پھاٹک کھولا [illegible] گئے۔

چند دنوں بعد مجھے ایک خط ملا، جس میں تحریر تھا کہ خاں صاحب نے وہ تمام مرغیاں اماں سے لے کر کوٹھے پر [illegible] ور چیلیں اُن کی خوشی کو مرغیوں سمیت نوچ نوچ کر کھا گئیں۔

خاں صاحب نے اس کے بعد فرار کے کئی راستے اختیار کیے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائے۔

لیکن دعوت کی یہ خفگی تادیر قائم نہ رہ سکی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شقو اپنے چھوٹے بھائی تقو کو لے کر ہمارے [illegible] ے۔ اشتیاق کو کچھ دنوں کی چھٹی تھی اور کیڈٹ صاحب اپنے خاندان سے کچھ ہمت، حوصلہ افزائی اور محبت کی گرمی کا [illegible] نے آیا تھا۔ بابا جی محمد خاں سے تو سب بچوں کا دوری اور سرد مہری کا رابطہ تھا لیکن اماں جی ان ساری کوتاہیوں کو [illegible] خوشی سے برابر کر دیتیں۔

تقو کے سنہری بالوں میں سرسوں کے تیل کا مساج کیا جاتا۔ اُس کی پسند کے کھانے پکائے جاتے۔ تقو اماں
کے کمرے میں سوتا۔ وہ پھل شوق سے کھاتا جو اماں جی امیری بیگم سے خرید کر الماری میں رکھتی تھیں۔

ہمارے گھر میں گھستے ہی تقو نے مجھے بے تکلفی سے پوچھا۔ ''کاکی! تمہارے پاس کرکٹ کا بلا ہے؟''

''تم آرام سے برفی کھاؤ۔ تمہیں کرکٹ سے کیا'' میں نے جواب دیا۔

''بھائی میں Sportsman ہوں۔ روز جوگنگ کرتا ہوں۔ سوئمنگ میری عادت ہے۔ میں یوں بیٹھ کر صرف
باتوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہاں مرزنگ روڈ میں بھی کوئی نہیں کھیلتا۔ نہ ان ڈور نہ آؤٹ ڈور.....''

اتنے میں ریزی کہیں سے ایک ہیں بال کا ڈنڈا تلاش کر کے لے آیا۔ یہ ڈنڈا اس کوٹھی میں پرانا پڑا ہوا تھا۔

''کیا اس ڈنڈے سے کام بن جائے گا؟'' ریزی نے سوال کیا۔

''وِراہٹ لگانا مشکل ہوگا لیکن گزارہ ہو جائے گا..... اور وکٹیں؟'' تقو نے پوچھا۔

''یار کیا مصیبت ڈال رہے ہو۔'' چائے پیتے ہوئے خاں صاحب بولے۔

''دیکھیں تو سہی کیا مزا آتا ہے۔'' تقو نے کہا۔

اس کے بعد تقو اور ریزی نے جنگلی سرکنڈوں میں سے خشک ڈنڈے تلاش کر کے برابر کی وکٹیں بنائیں۔ لا
بازار بھیج کر گیند منگوایا۔ یہاں بازار میں کھیلوں کی دوکان نہ تھی۔ پتہ نہیں لالو کس دکاندار سے ٹینس کا ایک بال لے آیا۔

کھیل کا بنیادی سامان تیار ہو گیا۔ ہم سب بیڈمنٹن، سوئمنگ، کیرم بورڈ، لوڈو کے شوقین تھے۔ فٹافٹ تیار ہو
گئے۔ طے یہ پایا کہ چونکہ زیادہ کھلاڑی موجود نہیں اس لیے ہر کھلاڑی اپنی اپنی رنز بنائے گا اور جو سب سے زیادہ رنز بنائے
وہی جیت گیا۔

وکٹیں سیڑھیوں کی طرف فٹ کی گئیں اور باؤلر پھاٹک کی طرف سے حملہ آور ہونے لگا۔ ہر کھلاڑی دو دو اوور
گیند دینے کا مجاز تھا۔ ان بارہ گیندوں میں اُس کی پوری کوشش ہوتی کہ بیٹس مین آؤٹ ہو جائے۔ نلکے والے حوض سے
آگے چھکا شمار ہوتا۔ اس کھیل میں ہر کھلاڑی کافی روندی مارتا۔ اپیلیں ہوتیں اور ہر کھلاڑی چونکہ بزعم خود ریفری بھی تھا
کھیل میں ہلا گلا رہتا۔

میرے کزن معظم سب سے کمزور کھلاڑی تھے۔ وہ دو چار گیندوں میں آؤٹ ہونا شروع ہو جاتے لیکن اُن کی
آرٹ یہ تھا کہ پورے دو اوور کھیل کر نکلتے۔ کبھی کبھی میری سہیلی محمودہ منظور آ جاتی۔ اس کا نام چھوٹتے ہی تقو نے ''بنو'' رکھ
دیا تھا اور کبھی کبھی وہ نام رکھنے کی وجہ اس مصرع سے دیتا ''بنو والک چیتے ورگا۔''

بنو متحمل مزاج تھی، جلدی آؤٹ ہونے پر اُس نے کبھی برا منایا نہ کسی کے بنو پکارنے ہی کا..... ہم سب جیتنے
کے شوقین تھے۔ ہمیں جیتنے یا ہارنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس کھیل کے علاوہ اشتیاق نے ایک اور کھیل بھی ہمیں سکھایا۔ یہ ایک طرح سے چور سپاہی کا کھیل تھا۔ رات
کے اندھیرے میں سب چھپ جاتے اور ایک کھلاڑی سپاہی بن کر تلاش میں نکلتا۔ جب اُسے کوئی دوسرا کھلاڑی نظر آتا۔
وہ کہتا ''سمی Smy۔'' یعنی (It is me) اور کھوجنے والا کھلاڑی پھر سپاہی بن جاتا۔ کھیل کھلاڑی میں مشغول سب

...ے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

...م سے بچھڑ کر جب تقو واپس ''کاکول'' جاتا تو اُس کے خط مجھے، ریزی اور معظم کو آتے رہتے۔ یہاں بھی ...ے میں کبھی کسر نہ اُٹھا رکھی گئی۔ خاں صاحب البتہ محتاط رہتے۔ وہ اگر دو قدم آگے بڑھتے تو تین قدم پیچھے بھی اُسی ...ٹ جاتے۔ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا جو جھڑکتا، ٹوکتا لیکن ابھی اقدار زندہ تھیں۔ ان دیکھے والدین کی ناراضگی ...اور معاشرے سے ڈر بھی نئی پود کو بے راہ روی سے روکے رکھتا۔

اشتیاق کے بعد ''نیلو'' ہمارے گھر کا فرد بن گئی۔ نیلی آنکھوں والی ڈیڑھ دو برس کی بچی ریزی اور مجھے پسند ...بھائی اور باجی ضیاء کی بیٹی نیلو کو سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر سائیکل سٹینڈ پر اُس کے دو تین جانگیے رکھ کر خاں ...پارک آتے۔ ان دنوں لاہور کی سڑکوں پر رش نہ تھا۔ اتنا سفر خاں صاحب بڑی سہولت سے طے کر لیتے ...حادثے کا خوف دامن گیر نہ ہوتا۔ ٹریفک مہربان تھی۔ سڑکیں کشادہ اور ویران۔

نیلو سائیکل کی سیر پر خوش ہوتی اور خاں صاحب اُسے خوش دیکھ کر نہال ہوتے۔ ابھی خاندان مٹھی بند ایک ...محبت میں سرشار لوگوں کا مجموعہ تھا۔ مزنگ روڈ والے شقو پر تو اعتماد کرتے ہی تھے، رفتہ رفتہ اُنہیں ہم پر بھی اعتبار ...

اس چھوٹی سی بچی میں خاں صاحب کی جان تھی۔ ریزی میں محبت کرنے والی روح تھی۔ وہ نیلو کو دودھ پلا کر ...نیلو کے آتے ہی اس اُجاڑ، ڈھنڈار پرانی بوسیدہ کوٹھی میں جان پڑ جاتی۔ جس چھوٹے سے چوبچہ نما حوض کا ذکر ...ہوں یہ نیلو اور میری بہشت تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ میں نیلو کو نلکے کے نیچے کھڑا کر دیتی اور ہتھی اوپر نیچے کرنے لگتی۔ نیلو پانی کی دھار تلے ...ہو جاتی۔ جونہی ٹھنڈا پانی پڑتا وہ ہلکی سی سسکی بھر کر تھوڑا سا لرزتی۔ لیکن اگر پانی بند کر دیتے تو وہ رونے لگتی۔ وہ اتنی دیر ...رہتی جب تک اُس کا جسم ٹھنڈا برف نہ ہو جاتا۔ اُس کی آنکھوں میں دھندی چھا جاتی اور اُس کے ہونٹ کانپنے ...میں اُسے تولیے میں لپیٹ کر اندر لے جاتی۔

نیلو کے آنے سے ہم لوگ جیسے ''گھر گھر'' کھیلنے لگتے۔ نیلو کو میرے سپرد کر کے خاں صاحب نے کبھی کوئی ...دیں۔ میں نے کبھی اُن سے نہ پوچھا کہ وہ کیا کھائے گی؟ کیا پیئے گی؟ کب جاگے گی؟ بس اس ننھی گھر داری کی ...ن خاموشی تھی۔

ایک روز گہری شام کے وقت کالا پھاٹک کھلا۔ اقبال بھائی اندر آئے۔ یہ میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ دُبلا ...جسم، خاں صاحب جیسا چہرہ، لب و لہجے میں شائستگی۔ بڑی لجاجت سے آگے بڑھے۔

''نیلو...... کیا نیلو یہاں ہے؟''

''جی آئی تھی لیکن شقو کے ساتھ چلی گئی۔''

''کتنی دیر ہوئی؟'' بھالو بھائی نے سوال کیا۔

''یہی کوئی آدھا گھنٹہ۔''